رشید احمد صدّیقی

"...... میری ایک عادت ہے کہ اُردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اُسے اُٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اُردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں، اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دلچسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے..."

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میری پسند ناپسند، رہن سہن، گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیتِ مجموعی "شخصیت" کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لئے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیئے۔

رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے استاد اور سب سے اچھے ماں باپ، بھائی بہن —— سبھی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی عزت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی البتہ ریاضی اور اس کی ذریات، الجبرا، اقلیدس اور مساحت ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ ان سبھوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رسوا کیا کہ ط

انگلیاں دور سے اٹھتی تھیں کہ وہ آتے ہیں

ہم تین چار دوست ایک ہی بنچ پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے۔ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیے جاتے جب بھی پاس مارکس تک رسائی نہ ہوتی۔ امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا اس لئے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صد تک ہماری باتیں کتابی باتوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں، ریاضیات میں آخر کیا سرخاب کا پر لگا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔

انٹرنس میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے کیا۔ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی خاص طور پر جون پور کے اس بورڈنگ ہاؤس کی، جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی نہ قواعد و ضوابط کی ایسی کچھ پابندی تھی۔ عموماً ہر سینئر لڑکا جونیئر لڑکے کا نگران ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لڑکے کے نگران خواہ وہ جونیئر ہو یا سینئر، کسی لڑکے کے دور یا قریب کے وہ رشتہ دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آئے ہوتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم ان کا کہنا نہ مانے یا ان کی موجودگی میں اس سے کسی قسم کی لاپروائی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

جون پور تاریخی شہر ہے۔ وہاں شاہانِ شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گزرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پل ہے۔ پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف اتنا کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں آتے جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لئے جمع ہوتے، شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کسی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لئے گم ہو جاتے۔

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں شیعہ کانفرنس کا ایک بڑا شاندار جلسہ جون پور کے شاہی قلعہ کے اندر منعقد ہوا تھا۔ تصور کی نگاہ میں حضرت صفی مرحوم اپنی مشہور نظم بڑے دل نشیں اور ولولہ انگیز لہجے میں سناتے نظر آتے ہیں ؎

جون پور اے مولدِ سلطانِ عادل شیر شاہ
تیرے آثارِ قدیمہ تیری عظمت پر گواہ

میں نے یہ سماں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے جون پور واقعتاً اپنی عظمتِ دیرینہ کے ساتھ ہمارے اردگرد آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو۔

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر ان ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعراء کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشیں ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور معلموں میں نظر نہیں آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

طالب علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا، اس کتب خانے میں جو دوسری منزل پر واقع تھا، کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اردو انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ یہاں سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ اس عمر، زمانے، احول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی ایسے معلوم ہوتا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنف تھا۔ میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا نیناک رستخیز رک جائے گا۔

مجھے ہر طرح کی چیزیں پڑھنے میں لطف آتا تھا البتہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی میں زبان و ادب کے اعتبار سے انگریزی کو اردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ اور میرا ہی خواہ ہے۔ اردو کتابوں کی عبارت کا اکثر یہ اثر ہوتا جیسے مصنف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہے: مجھے کوئی فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اسی طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈمڈ ہو کر ذہن میں آتیں۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان و ادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔

جنگِ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں، پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا، شریفانہ اور پُر وقار جلوس، نہ پولیس کا انتظام، نہ ایسا کوئی اژدہام، ہزار پانسو آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ تخمیناً ایک میل کا فاصلہ آہستہ آہستہ طے کرتا اور پھر منتشر ہو جاتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ گو یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم ؎

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا

ایک صاحب نے بڑے پُر اثر لہجے و انداز سے سنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے

اور " رہے نام اللہ کا " کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی سے برہم ہوگئی۔

میری ایک عادت ہے کہ اُردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اسے اُٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ میں اُردو کی ہر چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دلچسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے۔ اردو میں لکھنے کے اتنے انداز، لتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پیترے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محظوظ یا منغص ہونا لازمی ہے۔ موضوع سیاست، تربیت، انقلاب، امراض، ادویات، عورت یا عقبیٰ جو کچھ ہو کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا۔

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پاتی تھی۔ یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور اسلوبِ تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب عبدالمجید صاحب رئیسِ اعظم جون پور کے داماد تھے۔ سُرخ و سپید رنگت، بلند قامت، متناسب الاعضا، خوبرو، خوش گفتار، نکاہ نیچی رکھتے تھے۔ گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں سحر کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو۔ بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجہ کی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آجاتا ہو۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس کا تذکرہ بھی کر دوں کہ ہائی اسکول سے پہلے کی میری تعلیم کیا اور کیسی تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد سے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اسی طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مکدر اُردو میں پڑھائیں۔ اسی دوران میں ایک اور مولوی صاحب سے چند سالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح کا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو۔ یعنی مولوی صاحب قرآن شریف پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں۔ فارسی جانتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو عربی، صرف مسئلے مسائل سکھانے بتانے پر اکتفا کرتے ہوں تو وہی سہی۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو۔ گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلّے والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔

ان مضامین اور اسی طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو، پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لئے دیہات کے پرائمری سے بھی پرائمری سکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ پرشور ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آئی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لئے وجہِ معاش قرار پائی یعنی اُردو، میں نے اسکول میں سیکھی ایسے ماسٹر سے جو اُردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور درد مند انسان۔ کوئی کلاس سامنے ہو وہ پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن۔ وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہ رکھتے تھے اس لئے کہ میں نے اُن کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا۔ ان پر جو کچھ لکھا یا بنا ہوتا

دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے۔ نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے۔ صرف راما ئن سُناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے، نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے، دور سے ترس کھاتے، مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے۔

بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تیر بہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بڈھیا ملا یا مزار کی خبر لی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کر دی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پئے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے آسیب سے نجات پانے کے لئے اتار کے درختوں میں کسی کے لئے اتنے نقوشِ سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لئے۔

۱۹۱۵ء میں یہاں فرسٹ ایر میں داخل ہوا جب سے آج تک کم و بیش چالیس بیالیس سال ان تمام چھوٹے بڑے انقلابات سے دو چار رہا جو علی گڑھ میں یا اس سے باہر دور و نزدیک پیش آتے رہے۔

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھی ڈبل روٹی بھی کھا لیتا۔ لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا دیکھا، کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا؟ بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی لیکن اس کو چھیڑے کون؟ اس لئے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت مشکل ہوگا۔ تمام زندگی میں یہی ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا۔

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا۔ تعطیل کلاں برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پرانے طلبا کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہو جاتیں۔ یہ فطرت اور کالج کی ستم ظریفی تھی یا سازش کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لئے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا۔

کچی بارک (سید محمود کورٹ) کیا چیز تھی؟ کوئی عمارت تھی، عبادت تھی، علامت یا حادثہ، یہ سب تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در، نہایت درجہ نیچا، بودا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور گھن بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک مٹیالی گرم دوزخی دھول اور دھند میں جھول رہی ہو۔ کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی!

میں نے کچی بارک پر "گل منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں سے اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد "سیاحت برما" کے عنوان سے کچھ جو میگزین میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں کلکتہ، چٹاگانگ، میمیو کے دورے میں پیش آئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھ سے یہ مضمون لکھوایا جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس موڑ پر

ڈال دیا وہی میری تقدیر تھی جو کچّی بارک کی صورت و معنی میں مجھ پر منکشف ہوئی، جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے نہ میں اُسے جُدا کر سکتا ہوں۔ دراصل تمام عمر کچّی بارک ہی میں رہا اور اب بھی ہوں۔

ابتدا میں مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اردو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دُور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اردو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدن سے تھے۔ یہ تاثرات کلیتہً احمقانہ تھے لیکن بہت دنوں بعد جب میں خاصا کم احمق رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اُردو کا لہجہ اور تلفظ سُن کر ایک لمحہ کے لئے دم بخود ہو گیا تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے!

ایک دن مولانا (اقبال احمد خاں) سہیل سے جو اِن دنوں میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے اپنے یہ وسوسے بیان کئے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے، اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ وہیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ بولے "ارے بھائی! ٹکسالی اُردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ بجنوری ہی پر موقوف نہیں ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دُور افتادہ خطوں میں اردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اُردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اُردو بھی بول سکتا ہے۔ اچھا دیکھو کسی دن تم کو ٹکسالی اُردو سنواؤں گا۔"

مولانا نیز ہم سب کو ذاکر صاحب مغرب کے جدید علوم اور لٹریچر سے آشنا رکھتے تھے۔ لٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کرلاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان سب پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلے میں ہم سب کے لئے بہ طیبِ خاطر اور کبھی کبھی خوانچے والوں سے پھل، شیرینی یا کباب خرید دیتے۔ شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، تنقید علمی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روزمرّہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کر دی تھی۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا: "چلو تم کو دلّی کی زبان سنواؤں۔" چنانچہ ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تک کچّی پکّی بارکوں کے غلط کروں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدّت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ بالآخر فضل الرحمٰن قدوائی (نجی مرحوم) کے کمرے پر پکّی بارک پہنچے۔ پوچھا: "آغا حیدر حسن نہیں آئے؟" مرحوم نے ملازم بھیج کر کہیں سے آغا صاحب کو بلوایا۔ موصوف دلّی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اب حیدر آباد میں رہ بس گئے۔ دلّی کی زبان بالخصوص بیگمات کی، دلی کے کوچے، دلّی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔

مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا: "بھئی آغا حیدر ان کو دلّی کی زبان سنوانے لایا ہوں۔" پھر تو آغا صاحب نے "گل افشانیٔ گفتار" ہی نہیں "انداز" گل افشانیٔ گفتار کا وہ رنگ دکھایا کہ میں دنگ رہ گیا۔ اور یہ سب اس طور پر نہیں جیسے کوئی رٹی ہوئی تقریر سنا رہا ہو بلکہ جیسے ہم آپ روزمرّہ کے واقعے پر بے تکلف بات چیت کر رہے ہوں۔ یا جیسے ریشم پر موتی غلطاں ہوں۔

کچھ دنوں بعد سیّد آلِ عبا قادری مارہروی سے ملاقات ہوئی۔ یہ کالج میں مجھ پر روزگار تھے۔ طلاقتِ لسانی اور علم مجلسی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے بڑوں کی کور دبتی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ خود حضراتِ لکھنؤ ان کے اس کمال کے معترف

تھے۔ سید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جن صاحبوں کو مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آغا صاحب اور سید صاحب نے اس زمانے کے دہلی اور لکھنؤ کے ماحول و معاشرت کی کیسی دلکش عکاسی کی ہے۔ آغا صاحب کے مضامین "بے پر کی" کے عنوان سے آج سے تقریباً ۳۵، ۳۶ سال قبل میں نے علی گڑھ میگزین کی طرف سے شائع کئے جو بہت پسند کئے گئے تھے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ میں کرکٹ کے بڑے زبردست میچ ہوئے۔ ہندستان کی تقریباً ساری مشہور ٹیمیں آئیں اور دونوں طرف نامور کھلاڑی اور بولر برسرِکار دیکھے گئے۔ چار سال تک مسلسل علی گڑھ کی فیلڈ پر علی گڑھ کی جیت ہوئی۔

کھیل کے بعد کالج کی زندگی میں یونین کو بڑا دخل تھا جس عہد کا ذکر کر رہا ہوں اس میں انگریزی کے سب سے اچھے مقرر ذاکر صاحب اور اردو کے مولانا سہیل تھے اور دونوں زبانوں میں ذاکر صاحب۔ عام خیال یہ تھا کہ انگریزی یا اردو کا کیسا ہی زبردست مقرر کیوں نہ آجائے ذاکر صاحب اور سہیل صاحب علی گڑھ کی نمایندگی بہتر سے بہتر طور پر کریں گے۔ تقریر کے کیسے کیسے معرکے ان دونوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں سر کئے۔ جب اچھی تقریر کرنا، قطع نظر اور باتوں کے بہت بڑا اور اتنا ہی مشکل فن سمجھا جاتا تھا اور خود کالج میں اچھی تقریر کرنے والے کافی تعداد میں موجود تھے۔

کالج میں طلبا کے علاوہ اسٹاف میں دو اصحاب کو انگریزی میں تقریر کرنے کی شہرت حاصل تھی۔ ایک تاریخ کے پروفیسر اے ایف رحمٰن بی۔ اے (آکسن) ممبر لیجسلیٹو کونسل اور ممبر پبلک سروس کمیشن جن کو گورنمنٹ نے سر کے خطاب سے بھی نوازا تھا اور دوسرے پروفیسر انعام اللہ خاں جو انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ اولڈ بوائے کی حیثیت سے عبد الرحمٰن صدیقی (سندھی) کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا۔ علی گڑھ سے شیفتگی پیدا کرنے میں صدیقی صاحب کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔

انعام اللہ خاں صاحب انگریزی اور منطق پڑھاتے تھے۔ پرانے انداز کی مرصع و مقفیٰ انگریزی بڑی روانی اور طنطنے سے بولتے تھے۔ منطق کے نوٹ لکھاتے اور زبانی سنتے۔ ایک دفعہ مجھ سے منطق کی کلاس میں برہم ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ سبق سنانے کی میری باری آئی۔ منطق مجھے پسند نہیں اس لئے کہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے۔ رشید نے یوں گھبراتا ہوں کہ اس میں مجھے تشابہ بہت لگتا ہے۔ یعنی غزل پڑھتے پڑھتے اللہ رسول کا ذکر آجائے تو مناجات شروع کر دیتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میں نے لکھائے ہوئے نوٹ میں اپنی طرف سے پیوند لگانے شروع کر دیئے۔ وہ بھی اس طرح کہ اکثر پیوند کا سائز اصل سے بڑھ جاتا اور پیوند بھی جگہ جگہ سے خستہ و خوار۔ اس پر یک لخت کتاب بند کر دی اور بڑی سنگلاخ انگریزی اور خشمناک لہجے میں فرمایا" دیکھو جی! یا تو انعام اللہ خاں سے اچھی انگریزی لکھو اور بولو یا پھر انعام اللہ خاں کی انگریزی رٹو، بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔"

انٹرمیڈیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کا جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مرحوم تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگران بھی رہے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اسٹاف میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظریف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ خوب سوجھتی تھی۔ اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے۔

اور بقیہ نے اپنے سر کر لئے۔ اس مہم میں راقم السطور ان کا دستِ راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لئے اصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجیہہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا عطائی بھی اوراس یا غرضی کی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لئے ایک نیا کھاتہ کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتہ" تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کا نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام "گھپلا کوش" یا کڑھپ کوش" رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے " در عمل کوش ہر چہ خواہی پوش"۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دیئے جاتے جن کی تعبیر و توجیہہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی امید باقی رہ جاتی۔ ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے استدادِ زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے بھی۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر و ادب کی سرپرستی تمام تر والیانِ ملک اور امرا بر دارلوں کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی علی گڑھ شعرا کی ان معنوں میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر و منزلت میں بیش از بیش حصہ لیتا رہا اور اس اعتبار سے شعر و سخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے جس کی نظیر شاید کسی دوسری درس گاہ میں نہ ملے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حُسنِ قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلّم ہو جاتی۔

سب سے دلچسپ پوزیشن ڈائننگ ہال کی تھی۔ یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی رہی تھی اور آج بھی رہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدا بہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ طنز اور ظرافت کی میری ابتدائی مشق کچی بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔

کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الفرض کا شمار طلبا کے بڑے قابلِ قدر اداروں میں ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ کم نہیں۔ ۱۸۹۸؁ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسے قائم کیا تھا۔ اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے۔ ایک نادار لیکن ہونہار طلباء کے لئے مالی امداد فراہم کرنا دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہوا سکو دور کرنا۔ اس طور پر انجمن کا کام سرسید کے مقاصد کو آگے بڑھانا تھا۔ جب سے آج تک انجمن وہ فرائض یکساں تندہی سے بجا لا رہی ہے۔ ہر سال تعطیل میں طلبا ملک کے مختلف دور و نزدیک حصوں میں وفد لے کر جاتے ہیں اور جو کچھ نفع ہوتا ہے لے انجمن کے فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔

سوسائٹی سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مواقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل، دانوازی، بخیر اندیشی، خوش مزاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا وہ میرے طور طریقوں نیز میرے سلیقۂ تحریر کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین، خطبے، پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لئے لکھنے پڑے میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ ہسپتال کی وہی عمارت تھی جو آج ہے۔ حکیم صاحب کا مطب ماریسن روڈ پر اس جگہ تھا جہاں اب ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں کم و بیش پندرہ سولہ سال راقم السطور مقیم رہا۔ اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اسی زمانے کی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کر لے، دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو۔ تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی کہ گو میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا۔

ہسپتال میں بڑے ڈاکٹر صاحب تھے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتہ ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو بعض بر بنائے قافیہ یا حلیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا۔ پستہ قد، سن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری، داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس، آواز مخدوش، ہاتھ میں رعشہ، نسخہ لکھتے تو انگشتِ شہادت اچھلتی رہتی۔ اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لئے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر ادھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح کی مہم میں ہمرکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: "قربان جایئے اس کمال پر، ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور ٹائپ بھی کرتے جا رہے ہیں"۔

گزشتہ اوراق میں جن اصحاب یا اداروں کے بارے میں عرض کیا گیا ہے ان کے علاوہ کتنے اور ممتاز و منفرد کردار ذکر ہونے سے رہ گئے جو ذہن کے دھندلے افق پر بار بار اور بے اختیار ابھرتے ہیں لیکن ان صفحات میں ان سب کا ذکر میرے لئے بڑا مشکل ہے۔

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.

107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضاؔ
مدیر
صابر دت